تحریر : علامہ محمد اسد (حال متوطن مراکش)
ترجمہ : محمد معین خان بی اے (عثمانیہ)

اسلام کا مقصد و منہاج

قسط دوئم

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کاملیت (PERFECTION) کی اصطلاح جن معنی میں یہاں استعمال ہوتی ہے اس کی وضاحت کردی جائے تاکہ کوئی غلط فہمی نہ ہونے پائے، جہاں تک حیاتیاتی اعتبار سے محدود و محصور نوع انسانی کا معاملہ ہے۔ کاملیت مطلقہ (OBSOLUTE PERFECTION) کے تصور پر کچھ سوچا ہی نہیں جاسکتا، کیوں کہ مطلقیت تو صرف صفات الٰہی کا حق ہے۔ اس لئے جب کبھی انسانی کاملیت (HUMEN PERFECTION) کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ اپنے صحیح نفسیاتی اور اخلاقی معنی کے اعتبار سے محض ایک اضافی اور وہ بھی انفرادی چیز ہوتی ہے۔ ایسی کاملیت سے ہرگز ان تمام اوصاف حمیدہ کا حامل ہونا مراد نہیں ہے، ذہن جن کا تصور کرسکتا ہے اور نہ اس سے مراد خارج سے نئے نئے اوصاف کا اخذ و اکتساب کرنا ہے۔ بلکہ اس سے تو فرد کے پہلے ہی سے موجود اوصاف کا ایسا فروغ مراد ہے جو اسکی خلقی مگر خوابیدہ قوتوں کو ابھار دے۔ مظاہر حیات (LIFE PHENOMENA) قدرتی طور پر متنوع ہونے کے باعث ہر انسان کے پیدائشی اوصاف مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ فرض کرلینا کہ تمام انسانوں کو ایک ہی جیسی کاملیت حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیئے اتنی ہی بعید از عقل بات ہوگی جتنی کہ دوڑ اور بار برداری کے دو نہایت ہی عمدہ اور قوی گھوڑوں کے بارہ میں یہ سمجھ لیا جائے کہ دونوں بالکل ہی ایک جیسے اوصاف کے حامل ہیں۔ بلاشبہ یہ دونوں گھوڑے اپنی اپنی جگہ کامل تو ہوسکتے ہیں مگر وہ ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہوں گے۔ نوع انسانی کا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ اگر کاملیت کسی مخصوص نمونہ پر معیاری قرار دیدی جاتی ——— جیسا کہ مسیحیت نے تارک الدنیا درویش کے نمونہ پر کاملیت کا معیار قائم کر رکھا ہے ——— تو لوگوں کو اپنے انفرادی فرق و امتیاز سے یا تو دست بردار ہوجانا پڑتا یا اسے متغیر و پامال کر دینا پڑتا۔ اس عمل سے انفرادی تنوع (INDIVIDUAL) کے

اس قانونِ الٰہیہ کی صریح خلاف ورزی ہوتی ہو روئے زمین کی ساری حیات پر غالب و مسلط ہے۔ اسی لئے اسلام جو جبر و تشدد کا مذہب نہیں ہے، انسان کو اپنے شخصی اور سماجی وجود کے دائرہ کے اندر بہت وسیع گنجائش عطا کرتا ہے تاکہ مختلف افراد کے نوع بہ نوع اوصاف، طبائع اور نفسیاتی میلانات اپنی اپنی افتادِ منشار کے مطابق ایجابی فروغ کی طرف اپنی اپنی راہیں پیدا کرلیں۔ اس طرح ایک آدمی چاہے تو تارک الذات بن جائے یا جائز حدود کے اندر اپنے شہوانی ممکنات سے بھرپور لذت حاصل کرے۔ چاہے تو خانہ بدوش بن جائے جو آزوقتہ فردا کے بغیر صحرائے لق و دق میں مارا مارا پھرتا ہے یا دولتمند تاجر جو ہر وقت اپنے مالِ تجارت میں گھرا رہتا ہے۔

غرض یہ کہ انسان جب تک خداوندِ عالم کے نافذ کئے ہوئے قوانین کی صدق و شعور کے ساتھ اطاعت کرتا ہے، اس وقت تک وہ آزاد ہے کہ اپنی زندگی کو اپنی فطرت کی ہدایت کے مطابق جس صورت میں چاہے ڈھال لے۔ اس کا فریضہ یہ ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو نہایت خوش اسلوبی سے بروئے کار لائے تاکہ اس سے اپنے خالق کے عطا کردہ انعام حیات کی کماحقہٗ قدر ہو سکے اور یہ کہ وہ خود اپنی نشو و ترقی کے وسیلہ سے اپنے ہم جنسوں کی روحانی، سماجی اور مادی مساعی میں امداد و اعانت کرے لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ اسکی انفرادی زندگی کی صورت گری کسی معیار کی رہینِ منت نہیں ہوا کرتی، بلکہ وہ آزاد ہے کہ اپنے سامنے پھیلے ہوئے نامحدود جائز ممکنات سے جو ممکنات چاہے اس مقصد کیلئے منتخب کرے۔

اسلام میں اس "حریت فکر" کی بنیاد اس تصور میں ملتی ہے کہ انسان کی اصل فطرت بالالتزام صالح ہوتی ہے۔ مسیحیت کا تصور یہ ہے کہ انسان گنہگار پیدا ہوتا ہے اور ہندومت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان فی الاصل ذلیل و ناپاک ہوتا ہے۔ لہٰذا کاملیت کی منزل پر پہنچنے کے لئے وہ تناسخ کے ایک طویل سلسلہ سے افتاں و خیزاں گذرنے پر مجبور ہے۔ لیکن ان دونوں کے برعکس اسلامی تعلیم یہ دعویٰ کرتی ہے کہ انسان پاک --- مذکورہ بالا معنوں میں --- اور بالقوۃ کامل پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ کہ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔ اور یہ آیت ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے کہ: ثُمَّ رَدَدْنَاهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (سورہ ۹۵: ۴، ۵) پھر (فتہ رفتہ) اس (کی حالت) کو (بدل کر) پست سے پست کر دیا مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔

اس آیت میں اس عقیدہ کا اظہار کیا گیا ہے کہ انسان اصلاً صالح اور پاک ہوتا ہے، مگر خدا کے

ساتھ اسکی بداعتقادی اور اعمال صالح کے فقدان سے اس کی پیدائشی کاملیت غارت ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر انسان شعور کے ساتھ خدا کی توحید کا قائل ہو جائے اور خدا کے قوانین کے آگے اپنا سر اطاعت خم کر دے تو وہ اپنی پیدائشی کاملیت کو برقرار رکھ سکتا ہے، یا دوبارہ حاصل کر سکتا ہے۔ پس اسلام کی رو سے بدی نہ تو لابدی ہے اور نہ پیدائشی۔ یہ دراصل اخذ و اکتساب ہے۔ انسان کی متاخر زندگی کا جسکا سبب ان پیدائشی مثبت اوصاف کا بے جا اور بے محل استعمال ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ہر انسان کو عطا ہوئے ہیں۔ لیکن ہر صورت میں یہ فی نفسہٖ بالقوۃ کامل ہوتے ہیں، اور انسان کی انفرادی حیات دنیاوی کے دوران ان کا فروغ تام سے بہرہ مند ہونا ممکن ہے۔ ہم یہ مان لیتے ہیں کہ حیات بعد الموت اپنے احساس و ادراک کے یکسر بدلے ہوئے شرائط کے سبب ہمیں بالکل ہی نئے اوصاف و ملکات عطا کرے گی، جن کی بدولت روحِ انسانی کے لئے ترقی مزید کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔ لیکن اس معاملہ کا تعلق تو صرف ہماری حیاتِ اخروی سے ہے۔ حیات دنیاوی سے نہیں۔ اسلام پورے وثوق اور قطعیت کیساتھ یہ اعلان کرتا ہے کہ ہم میں کا ہر فرد آب و گل کی اسی دنیا کے اندر اپنے ان فطری ایجابی خصائص کی نشو و ترقی کی بدولت جن سے ہماری انفرادیتیں متشکل ہوتی ہیں، بھرپور کاملیت سے شاد کام ہو سکتا ہے۔

دنیا میں ایک اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو انسان کے لئے اسکی تمام تر حیات دنیاوی سے لطف اندوز ہونے کا ایسا امکان پیدا کرتا ہے کہ اس کی روحانی منزل لمحہ بھر کے لئے بھی اسکی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو پاتی۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ یہ چیز مسیحی تصور سے کس قدر مختلف ہے! مسیحی عقیدہ کی رو سے نوعِ بشر ایک ایسے موروثی گناہ کے بوجھ تلے لڑکھڑا کر گر پڑتی ہے، جو آدم سے سرزد ہوا تھا۔ اس عقیدہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کو اپنی ساری زندگی، کم از کم اذعانی نظریہ (DOGMATIC THEORY) کے اعتبار سے، حزن و ملال کی ایک تیرہ تار گھاٹی نظر آنے لگتی ہے۔ مسیحی عقیدہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ یہ زندگی دو مخالف قوتوں کی رزم گاہ ہے۔ ایک بدی کی قوت جس کی نمائندگی شیطان کر رہا ہے اور دوسری نیکی کی قوت جس کی نمائندگی حضرت مسیح علیہ السلام کر رہے ہیں۔ شیطان جسمانی ترغیبات کے ذریعہ ابدی نور کی جانب روحِ انسانی کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ روح حضرت مسیح کی ملکیت ہے اور جسم شیطانی موثرات کی بازی گاہ ہے۔ اس تشریح کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ عالم مادی تمام تر شیطانی اور عالم روح تمام تر ربانی ہے۔ فطرتِ انسانی میں جو چیز بھی مادی یا مسیحی الٰہیات کی اصطلاح میں "شہوانی" نظر آتی ہے۔ وہ راست نتیجہ

ہے۔ حضرت آدمؑ کی اس لغزش کا جو آپ سے شیطان کا مشورہ قبول کرنے کے باعث سرزد ہوئی تھی۔ لہٰذا حصول نجات کے لئے انسان پر لازم ہے کہ وہ اس عالم بشریت سے منہ پھیرے اور مستقبل کے عالم روحانی سے اپنا دل لگائے جہاں نوعِ بشر کے گناہ کا کفارہ مسیح مصلوب کی قربانی سے ادا ہو جاتا ہے۔

اگر اس عقیدہ کی عملی اتباع نہ بھی کی جائے ـــــ اور نہ کبھی کی گئی ـــــ تب بھی اس قسم کی تعلیم کا وجود ہی ایک ایسے آدمی کے دل میں جو مذہب کی طرف میلان رکھتا ہو، خطاداری کا ایک مستقل احساس پیدا کرنے کا موجب بن جاتا ہے۔ ایک طرف تو ترکِ دنیا کا حکم ناطق ہے، اور دوسری طرف زندہ رہنے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کا فطری تقاضہ ـــــ ان دونوں کے درمیان اس شخص کا دل ایک گیند کی مانند ادھر سے ادھر لڑھکتا رہتا ہے۔ ایک ناقابل گریز گناہ ـــــ اس لئے کہ وہ وراثت میں آیا ہے ـــــ اور مسیح مصلوب کے اٹھائے ہوئے دکھوں کے ذریعہ اس گناہ کے ـــــ پراسرار کفارہ کا تصور ہی انسان کے روحانی اشتیاق اور زندہ رہنے کی جائز تمنا کے درمیان سدِ سکندری بن جاتا ہے۔

اسلام میں ہمیں ازلی گناہ کے تصور کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ بلکہ ہم تو اس تصور کو عدلِ الٰہی کے تصور کے منافی سمجھتے ہیں۔ جب اللہ تبارک تعالیٰ بیٹے کو باپ کے اعمال کا ذمہ دار قرار نہیں دیتا تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ نوعِ بشر کی لاتعداد نسلوں کو نافرمانی کے ایک ایسے گناہ کا ذمہ دار ٹھہرائے جو ان سے نہیں بلکہ ان کے کسی سلف پیشین سے سرزد ہوا تھا۔ بلاشبہ اس عجیب و غریب مفروضہ کے بارہ میں فلسفیانہ تشریحات تو مرتب کی جا سکتی ہیں لیکن عقل سادہ کے نزدیک یہ مفروضہ ہمیشہ اتنا ہی مصنوعی اور بے بنیاد اور غیر اطمینان بخش رہے گا جتنا کہ خود تثلیث کا عقیدہ۔ اسلام میں چونکہ موروثی گناہ کے تصور کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، اس لئے یہاں نوعِ بشر کی نجات عام کا بھی کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ یہاں نجات و عذاب بالکلیہ انفرادی چیزیں ہیں۔ ہر مسلمان اپنا آپ نجات دہندہ ہے۔ اس کا دل اپنے اندر روحانی فوز و خسران کے تمام ممکنات سموئے ہوئے ہے۔ آدمی کی شخصیت کے بارہ میں قرآنِ پاک کا ارشاد ہے کہ: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (سورہ ۲: ۲۸۶) اچھے کام کرے گا تو اسکو ان کا فائدہ ملیگا، برے کرے گا تو اسے ان کا نقصان پہنچے گا ـــــ دوسرا ارشاد ہے: لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ. (سورہ ۵۳: ۳۹) انسان کو وہی ملتا ہے جسکی وہ کوشش کرتا ہے۔

لیکن انسان جہاں زندگی کے اس غمناک پہلو سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا جس کی مسیحیت تشریح

کرتی ہے، وہاں وہ حیات دنیاوی سے وہ مبالغہ آمیز قدر بھی منسوب نہیں کرتا جو جدید مغربی تہذیب منسوب کرتی ہے۔ ایک طرف مسیحیت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حیات دنیاوی ایک مشغلۂ باطل ہے تو دوسری طرف مغرب جدید ــــ مسیحیت سے بیزارانہ ــــ زندگی کا اتنا ہی مفتون ہے جتنا کہ ایک بندۂ شکم اپنی خوراک کا، بندۂ شکم اپنی خوراک کو نگلتا چباتا تو ہے، لیکن اس کا احترام نہیں کرتا۔ اس کے برعکس اسلام حیات دنیاوی کو اطمینان و احترام کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اسلام زندگی کی پرستش تو نہیں کرتا لیکن اسے ایک رفیع تر حیات کی طرف جانے والے راستہ کی ایک عضویاتی منزل سمجھتا ہے۔ چونکہ یہ زندگی ایک منزل ہے اور وہ بھی ضروری ولابدی اس لئے انسان کو نہ صرف اس سے حقارت کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ بلکہ اس کی کم قدری کرنے کا بھی اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ہمارا اس دنیائے آب و گل میں سے ہو کر گذرنا بھی قدرت کے نظام تقدیر کا ایک ضروری ایجابی جزو ہے۔ اسی لئے حیاتِ انسانی بے انتہا قدر کی حامل ہے۔ لیکن یہ حقیقت فراموش نہ ہونی چاہیئے کہ یہ قدر محض ایک قدرِ معاون (INSTRUMENTAL VALUE) ہے۔ اسلام میں مغرب جدید کی مادی رجائیت پسندی کی کوئی گنجائش نہیں ہے جو یہ کہتی ہے کہ "میری بادشاہت صرف اسی دنیا کی ہے" اور نہ مسیحی تحقیر حیات کے اس مقولہ کے لئے کوئی جگہ ہے کہ "میری بادشاہت اس دنیا کی نہیں ہے" اسلام کا راستہ ان دونوں کے بین بین ہے۔ قرآن مجید ہمیں اس دعا کی تعلیم دیتا ہے:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ	پروردگار ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت
فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا	میں بھی نعمت بخشیو اور دوزخ کے عذاب سے
عَذَابَ النَّارِ (سورہ ۲ : ۲۰۱)	محفوظ رکھیو۔

پس دنیا اور اسکی بھلائی کی بھرپور قدر و تحسین ہماری روحانی مساعی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں بنتی۔ مادی خوشحالی تو بہرحال ایک پسندیدہ چیز ضرور ہے لیکن یہ فی نفسہ کوئی مقصود نہیں ہے۔ ہماری تمام عملی سرگرمیوں کا مقصود و مدعا ایسے شخصی اور سماجی حالات کی تخلیق و پرداخت ہونا چاہیئے جو لوگوں کی اخلاقی توانائی کی نشو و ترقی میں ممد و معاون ہو سکے۔ اسلام انسان کو اس کے ہر عمل کی اخلاقی ذمہ داری کے شعور کی راہ سوجھاتا ہے۔ خواہ یہ عمل چھوٹا ہو کہ بڑا۔ انجیل کے اس مشہور و معروف حکم "قیصر کا قیصر کو دیدو اور خدا کا خدا کو دیدو" کے لئے اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ اسلام زندگی کی اخلاقی اور عمرانیاتی معاشی ضرورتوں کے مابین کسی آویزش کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ ہر معاملہ میں صرف ایک ہی انتخاب روا ہو سکتا ہے اور وہ ہے حق و باطل کا انتخاب اور بس ــــ بین بین قسم کی قطعاً کوئی چیز نہیں۔ یہی وجہ

ہے کہ اسلام میں عمل پر اخلاق کے ایک ناگزیر عنصر کی حیثیت سے اس قدر شدید اصرار کیا جاتا ہے۔ ہر مسلمان کو اپنے تئیں ان تمام حادثات کا ذمہ دار گردانا پڑتا ہے۔ جو اس کے گرد وپیش وقوع میں آتے ہیں۔ نیز ہر وقت اور ہر جگہ قیام حق اور انہدام باطل کی سعی وکوشش کی ذمہ داری بھی اس پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ اسکی تائید قرآن مجید کی حسب ذیل آیت میں ملتی ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَامُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔

(مومنو!) جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔ (سورہ ۳ : ۱۱۰)

یہ ہے اسلام کی اس "جارحانہ فعالیت" (AGGRESSIVE ACTIVISM) اور شہنشاہ پسندی (IMPERIALISM) کا جواز جو اہل مغرب کو اسلام میں اسکی ابتدائی فتوحات کی بناء پر نظر آیا کرتی ہے۔ ہم بھی بانگ دہل کہتے ہیں کہ بیشک اسلام "شہنشاہیت پسند" تھا، لیکن یہ شہنشاہیت پسندی ایسی تھی جسے شوقِ تسلط اور ہوس ملک گیری نے نہیں ابھارا تھا۔ نہ تو معاشی یا قومی خود غرضی ہی سے اس کا کوئی علاقہ تھا۔ نہ دوسری اقوام کے ضیاع ونقصان سے مسلمانوں کی آسائشات میں اضافہ کی طرح ہی سے اس کا کوئی واسطہ تھا، اور نہ کبھی اس کا یہ مقصد رہا کہ غیر مسلموں کو جبر واستبداد کے ذریعہ حلقہ بگوش کیا جائے۔ اس کا تو صرف ایک ہی مقصد تھا ـــــ جو آج بھی ہے ـــــ کہ انسان کی ممکنہ بہترین روحانی نشو وفروغ کے لئے ایک دنیاوی چوکھٹا تیار کیا جائے۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے معرفتِ اخلاق انسان پر خود بخود اخلاقی ذمہ داری عائد کر دیتی ہے۔ لہٰذا فروغ حق اور انہدام باطل کی تحریک وتشویق کے بغیر حق وباطل کے مابین محض ایک افلاطونی امتیاز قائم کر دینا فی نفسہ ایک ایسا عمل ہے جو بدیہی طور پر منافیٔ اخلاق ہے۔ اسلام کی رو سے نظام اخلاق انسان کی اس سعی وکاوش کے ساتھ جیتا اور مرتا ہے جو روئے زمین پر اس نظام کی بالادستی کے قیام واستحکام کے لئے بروئے کار لائی جاتی ہے۔

■

دین اور شعائر دین کا احترام

اس مضمون پر حضرت قاری محمد طیب صاحب کی نایاب تقریر کا اگلا حصہ اگلے شمارہ میں ملاحظہ فرمادیں